تبصرہ و تعارف

ریت، دریا اور سَراب (شعری مجموعہ)

شاعر: پی۔پی۔سریواستو رِند
صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۳۰۰/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

''ریت، دریا اور سَراب'' کہنہ مشق بزرگ شاعر پی۔پی۔سریواستو رِند کا چودھواں شعری مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ان کے تیرہ شعری مجموعے اور مضامین کی تین کتابیں شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکی ہیں۔پچاسی برس کی عمر میں بھی جناب رِند کا قلم اب بھی گُہر بار ہے ورنہ غالبًا ان کے تمام ہم عصر اپنے قلم کو قلمدان میں رکھ چکے ہیں۔مشاعروں کی دنیا سے دُور جناب رِند خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ان کی شاعری کی عظمت کا اندازہ ان کے شعری مجموعوں کی تعداد سے نہیں لگایا جاسکتا اور ایسا اندازہ لگانا بھی نہیں چاہئے۔شاعری کی قدر و قیمت کا تعیّن اس کی کمّیت سے نہیں، اس کی کیفیت سے کیا جاتا ہے۔انھوں نے ترقی پسندی کا زوال اور جدیدیت کی آمد، رجحانات اور تحریکات کے تمام دَور دیکھے ہیں۔ان تمام تحریکات سے گزر کر انھوں نے اپنی شاعری کا اُسلوب اپنے مزاج کے مطابق منفرد طور پر نہ صرف اپنایا بلکہ اس کو نبھایا بھی ہے۔

جناب رِند فکر سخن کی اپنی ایک مانوس اور منفرد دنیا میں جیتے ہیں۔شاعری ان کا ایک Passion ہے۔وہ اپنے تخلیقی وجدان کے وسیلے سے خود اپنے عہد کے اور اپنی ذات کے آشوب کو سمجھتے ہیں اور اپنی اختراعی صلاحیت سے نئی توسیع بھی دیتے ہیں۔اشعار میں الفاظ کے نئے تلازمات تلاش کرتے ہیں۔نئی بندشوں اور نئی تراکیب سے پیکر تراشی کرتے ہیں۔''ریت، دریا اور سراب'' میں ان کی شاعری کا یہ پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے:

چڑھتے سورج کی بھی خبر رکھئے
پاؤں کے نیچے دوپہر رکھئے
پرندے اُڑ گئے ہیں لِکھ کے شاخوں پر سفر نامے
یہ سُوکھے پیڑ سے بچھڑے ہوئے پتّے بتاتے ہیں
شجر کا رنگ ابھی اس کے بال و پَر میں نہ تھا
پرندہ اس لیے شاید مری نظر میں نہ تھا

رِند صاحب کے کلام میں پیکر تراشی کا یہ اسلوب شعوری بھی ہے اور غیر شعوری بھی۔اسی وجہ سے ان کے اشعار میں جذبہ و احساس کا فطری بہاؤ ہے۔معنوی تلازمات کا یہ خوش نما سلسلہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔رِند صاحب کے اکثر تلازمات قاری کو کسی خیالی یا تحریری دنیا کی سیر نہیں کراتے بلکہ ہزار شیوۂ زندگی کے خیاباں میں لے جاتے ہیں:

تضاد لفظ و معانی میں ہے، ہنر میں آ
غزل کے وسعتِ افکارِ معتبر میں آ
سلگتی فکر تو، زخمی رُتوں کا ایندھن ہیں
سو گرم ریت کے اُڑتے ہوئے بھنور میں آ
بستیاں ہُجرہ نشینوں سے جو خالی ہوجائیں
یہ جو رنگیں فضائیں ہیں زوالی ہوجائیں
پاؤں لکڑی کے لگالیں تو پھر گھر سے نکلیں
تاکہ اندیشے سفر کے نہ جلالی ہوجائیں

تنہائی اور گرد و پیش کے سنّاٹے کا احساس بھی رِند صاحب کے اس مختصر مجموعہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔شاید یہ ان کی ڈھلتی عُمر اور ماحول کی عدم ہم آہنگی کی دین ہے:

سنّاٹوں نے رات کا جب بازار لگایا
بھولی بسری یادوں نے دربار لگایا
دوپہری میں سُورج کی دربانی تھی
رات نے بھی دہلیز پہ پہرے دار لگایا

اس مجموعے پر نامور قلم کار حقانی القاسمی کا ایک طویل مضمون ہے جس میں انھوں نے پی۔پی۔سریواستو رِند کی شاعری کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔

کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے مضامین کے اقتباس نے ''ریت، دریا اور سراب'' کی معنویت کو مزید توانائی بخشی ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ رِند کے کلام میں انفرادی لہجہ اور شعری آہنگ کی طرفگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔اس کا سبب ان شعری تمثالوں کا متحرک استعمال ہے جو شاعر سے بہت قریب ہے۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے مطابق ان کو غزل کے فن اور موضوعات دونوں پر قدرت حاصل ہے۔وہ غزل کو جو چاہے موڑ دے سکتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ''ریت، دریا اور سراب'' قابلِ مطالعہ ہے۔

تبصرہ نگارہ: رؤف رامش
Z-217B، سیکٹر۔12 نوئیڈا، موبائل: 9910231670

زہرہ بیگم

مصنّفین: امیر مہدی، سلیم شیرازی
صفحات: ۲۸۰، قیمت: ۳۲۰/روپے
ناشر: کتاب والا، 2794 گلی جھوت والی، پہاڑی بھوجلہ، دہلی۔6

لکھنوی تہذیب وتمدن جس طرح ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اسی طرح اس کے راوی بھی شہرت رکھتے ہیں۔راویوں کی فہرست میں موجود اولین اور مؤثر ناموں میں بلاشبہ مرزا محمد ہادی رسوا اور عبدالحلیم شرر ہیں، جنھیں ان کی ندرت فکر، زبان دانی اور ایک تہذیب کو اس کی روح کے ساتھ پیش

کرنے کی وجہ سے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی بہت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں اور یہ سلسلہ وہیں ٹھہرا نہیں، بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنی پوری اہمیت وافادیت کے ساتھ جاری وساری ہے۔لکھنویت کی تاریخ وتہذیب کو لکھنے کا چلن آج بھی جاری ہے۔کہنا چاہئے کہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ مضبوط و مستحکم ہے،اس کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا بہرحال پروفیسر انیس اشفاق کے سر جاتا ہے، جنھوں نے دکھیارے لکھ کر نئے سرے سے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، پھر خواب سراب، پری ناز اور پرندے جیسے ناول لکھے۔اب ایک نیا ناول زہرہ بیگم منظر عام پر آیا ہے، جس کے مصنف امیر مہدی اور سلیم شیزاری ہیں، دونوں کا تعلق ادب وصحافت سے ہے اور لکھنؤ سے بھی،اسی لیے ناول کی زبان اور اس کا بیان قابل ستائش ہے،دونوں مصنف کافی دور تک ناول کو لے کر چلنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔لکھنؤ کا تاریخی کردار زہرہ بیگم کے حوالے سے اور اس سے متعلق دیگر کردار بھی کھل کر سامنے آئے ہیں،لکھنؤ کے چوک چوراہے، گلیاں، امام باڑے، کربلائیں، وہاں کا رہن سہن، خورد ونوش، لباس وزیورات، شادی بیاہ، طرز معاشرت، جدوجہد آزادی اور تقسیم ہند کی ہلکی پھلکی داستان بھی یہاں سمٹ آئی ہے،مرکزی کردار سے متعلق تمام تر ممکنہ جزئیات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول کے شریک مصنف سلیم شیرازی ایک جگہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ویسے پرچھائیاں جیسی قبیل کی تصنیفات پر کسی پیش لفظ یا مقدمے کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی گنجائش۔پھر بھی اپنی مٹی سے رشتے کی شدت،فطری امر ہے اور اس تعلق کا اظہار تو تمام پابندیوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔''

ایسا لگتا ہے کہ کتاب کا عنوان پہلے پرچھائیاں تھا بعد میں اسے تبدیل کرکے زہرہ بیگم رکھا گیا،مگر پیش لفظ میں کتاب کے عنوان کو تبدیل کرنا بھول گئے۔دراصل یہ اقتباس کتاب میں موجود مقدمے اور پیش لفظ کا جواز ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ فکشن سے متعلق کتاب میں شاذ ونادر ہی اب مقدمہ یا پیش لفظ لکھا جاتا ہے،ان ہی شذوذ میں یہ کتاب بھی شامل ہے،اس میں رواج زمانہ سے الگ بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں، جیسے مقدمے اور پیش لفظ کے علاوہ کتاب کا ٹائٹل بھی خالص پاپولر لٹریچر والا ہے،جیسا پہلے کبھی جاسوسی ناولوں یا ڈائجسٹوں کا ہوتا تھا،کتاب میں ۱۳۰ ابواب ہیں اور تمام ابواب کے عناوین دیے گئے ہیں، اکیسویں صدی کے ناول لیمی نیٹیڈ گرل اور صدائے عندلیب برشاخ شب کے ابواب پر بھی عناوین دیے گئے ہیں۔ناول زہرہ بیگم میں منظومات کا حصہ بھی خاصا بڑا ہے،جس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ دونوں مصنفوں کی شناخت نثر نگار سے زیادہ بحیثیت شاعر ہے،اس کے علاوہ غالبا رسوا کی اتباع کا معاملہ بھی ہے،کئی ابواب کسی شعر سے شروع ہوتے ہیں اور کئی ابواب کسی شعر پر ختم۔حالاں کہ اب ناول کے تقاضے کے علاوہ اشعار درج کرنا کارعبث سمجھا جاتا ہے۔

کتاب میں لکھنویت پوری طرح حاوی ہے اور ظاہر ہے ہونی بھی چاہئے چوں کہ یہ ناول زہرہ بیگم کی کہانی کا مہبط لکھنؤ ہے،کردار و اثرات لکھنوی ہیں،لیکن اس حقیقت سے سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقت جب تک تاریخ سے فکشن نہ بن جائے تب تک وہ ناولانہ ڈکشن کا حصہ نہیں بنتا،اپنی کم علمی کے باوصف میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں تاریخیت کی بہ نسبت ادبی کہانی پن اور دیگر ابتدائی ضرورتوں کی تکمیل کی کمی کا احساس ہوتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ ان مصنفوں کی آئندہ آنے والی کتاب میں یہ ساری چیزیں موجود ہوں گی۔کتاب کی اشاعت وطباعت اور تزئین پر کافی محنت اور صرفے کا احساس ہوتا ہے۔

تبصرہ نگار:نورین علی حق
B-91،حیات انکلیو،کھجوری پشتہ روڈ،غازی آباد،موبائل:7011529033

منظرنامہ

مصنفہ: اسنیٰ بدر
صفحات: ۱۹۷، قیمت:۲۵۰/روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی

منظرنامہ اسنیٰ بدر کا شعری مجموعہ ہے،اسنیٰ بدر کے نام کے ساتھ ہی ان کی کچھ نظمیں ہمارے ذہن میں پھولوں کی خوشبو کی طرح مہکنے لگتی ہیں۔اسنیٰ بدر آزاد نظم کی شاعرہ ہیں۔ان کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باحوصلہ خاتون ہیں اور ان میں اپنی زمین خود تیار کرنے کا عزم ہے،وہ کسی کی دست نگر نہیں ہونا چاہتیں۔پہلی نظم جو''دعا'' کے عنوان سے ہے۔اس میں ان کا حوصلہ صاف نظر آتا ہے،وہ صرف خدا پر بھروسہ رکھتی ہیں:

کسی سے کیوں کہوں جا کر
کوئی کیا دینے والا ہے
یہاں بے چین روحوں کو
بس اک تو نے سنبھالا ہے
زمیں ہموار کردی ہے
سمندر کو اچھالا ہے

اسنیٰ بدر کی نظمیں ماضی کی دلکش یادوں میں لے جاتی ہیں،کبھی انگلی پکڑ کر میلے کی سیر کراتی ہیں،کبھی دادی اور نانی کی محبت بھری آغوش میں تھپکی دے کر سلاتی ہیں،کبھی اپنے گاؤں کی گلیوں میں سیر کراتی ہیں اور کبھی بچپن کی حسین وادیوں میں پہنچادیتی ہیں۔اسنیٰ بدر نے نظموں میں کہیں علم و اخلاق،امن وسکون اور کہیں مناظر قدرت کا بیان کیا ہے تو کہیں ماضی کی خوشگوار یادیں بیان کی ہیں۔وہ ہر چیز کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ان کی نظم وہ کیسی عورتیں تھیں ملاحظہ ہو:

وہ کیسی عورتیں تھیں.....
جو گیلی لکڑیوں کو پھونک کر چولہا جلاتی تھیں

جو سل پر سرخ مرچیں پیس کر سالن پکاتی تھیں
بھری دوپہر میں برقعے پہن کر ملنے آتی تھیں
جو پنکھے ہاتھ کے جھلتی تھیں اور بس پان کھاتی تھیں
جو دروازے پہ رک رک کے رسمیں نبھاتی تھیں

اسنیٰ بدر کی نظموں میں ایک فطری بہاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر نظم میں تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قاری کے دل کی آواز ہے۔ انھوں نے جہاں ماضی کی حسین یادوں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے وہیں ورکنگ وومین کے مسائل پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ایک ملازمت کرنے والی ماں اپنے بچوں کے بچپن سے کیسے دور رہتی ہے اس کو بھی نظم میں پیش کیا ہے اور بچوں کو اپنی ماں سے کیا شکوہ رہتا ہے اور وہ بچے اپنی ماں کے لیے کیسے بے چین رہتے ہیں اسے مؤثر انداز میں بیان کرتی ہیں:

میری ماں تم کہاں ہو بتاؤ مجھے
سرخ پین میری کاپی کی رونق بنا
تم کسی مدرسے میں پڑھاتی رہیں
میں اکیلا ہی کمرے میں بیٹھا رہا
تم کہ بچوں کو سورج دکھاتی رہیں

اس مجموعے میں کئی نظمیں ''ماں'' کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ''ماڈرن ماں''، ''غریب ماں باپ کی کہانی''، ''عورت نامہ''، ''ماں کا شکوہ''، ''اقبال کی نظم ''ماں کا خواب پڑھ کر''، ''ماں کی برسی پر'' اور ''وہ کیسی عورتیں تھیں'' ان ساری نظموں میں ماں کا ہی کردار نمایاں ہے۔ اسنیٰ کی نظمیں ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہیں جو ہمارے لیے اجنبی نہیں بلکہ مانوس ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ کہیں کھو گئی ہے۔ اسنیٰ کی نظمیں ہمیں اس فضا میں انگلی پکڑ کر لے جاتی ہیں۔ ان کی نظم ''مارہرہ'' کے چند اشعار دیکھیں:

بان کے پلنگوں پر جب پھوار پڑتی ہے
چارپائی سیدھی سی کس قدر اکڑتی ہے
ساتھ والی چچی کے گھر سے زردہ آتا ہے
کان میں پہننے کو تازہ بیلا آتا ہے
خالہ بی غرارے کو تھام کر نکلتی ہیں
باجیاں سہیلی سے چھت پہ جا کے ملتی ہیں
نیرہ کی ہنڈ کلیا بھیا نے اڑا لی ہے
پہر بھر میں پکی کھچڑی لمحہ بھر میں کھالی ہے

اسنیٰ بدر نے اپنی راہ ایسی بنائی ہے جس میں سادگی ہے پرکاری نہیں۔ گزرے لمحوں کی بازیافت ان کی بیشتر نظموں کا موضوع ہے، جس کو پیش کرنے میں وہ کافی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ ان کی زیادہ تر نظمیں متاثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ دعا، اچھی اسنیٰ کچھ بات کرو، مارہرہ، کویتا، وہ کیسی عورتیں تھیں، خواب، ماڈرن ماں، عورت نامہ، تمہاری یاد، فیس بک، ابھی زندہ ہوں میں، ایک سچا خواب، سنو بریلی جانے والو!، بچھڑی دوست، وہ منظر نامے، الوداع نربھیا اور بچپن جاؤ ایسی نظمیں ہیں جو قاری کو پرانے دنوں میں پہنچا دیتی ہیں جہاں سے واپس آنے کا دل نہیں چاہتا۔ اسنیٰ لفظوں سے پیکر تراشنے میں ماہر ہیں۔ ان کی نظمیں دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔ وہ آسان زبان میں ساری باتیں اس طرح کہہ جاتی ہیں کہ قاری ان باتوں کے حصار میں تادیر کھویا رہتا ہے۔ خیال کو روانی سے برتنے کے ہنر سے وہ خوب واقف ہیں۔ وہ مستقبل اور حال کی چکا چوند سے متاثر نہیں بلکہ ماضی کی سادہ زندگی کو گلے لگاتی ہیں جس میں سادگی ہے، سچائی ہے اور بے لوث محبت ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسنیٰ بدر نے اپنی نظموں کے موضوعات سے قاری کو چونکا دیا ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ہمیں ان کے قلم سے ابھی اور بھی شاہکاروں کی توقع ہے۔

تبصرہ نگار: نشاں زیدی
B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی، صاحب آباد، ضلع غازی آباد (یوپی)

نظر اور تفہیم نظر

مصنفہ: ڈاکٹر نفیس بانو
صفحات: ۲۱۵، قیمت: ۳۰۰/روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

تنقید ہمیں کھرے کھوٹے کی پہچان کراتی ہے یعنی کہ اچھے برے میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ تنقید ہر انسان میں ہوتی ہے کسی میں زیادہ تو کسی میں کم، مگر ہوتی ضرور ہے۔ انسان کے پیدا ہوتے ہی تنقید اس کے ساتھ جنم لے لیتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے اسی طرح ہماری ذہنی پرکھ تیز ہو جاتی ہے۔ جس طرح بغیر تنقیدی شعور کے انسان مکمل نہیں ہوتا اسی طرح ادب بھی بنا تنقید کے مکمل ادب نہیں ہوتا۔ تنقید ہی ہمیں طریقہ وسلیقہ سکھاتی ہے بغیر تنقید کے ہم زندہ نہیں رہ سکتے جیسے ہمیں زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہے اسی طرح تنقید بھی ہماری زندگی میں اتنی ہی ضروری ہے، مکمل تنقید کا مطلب پہلے ادب پر تنقیدی نظر ڈالنا پھر اپنے خیالات پیش کرنا ہوتا ہے۔ تب جا کر ادب میں نکھار آتا ہے۔

زیر نظر تبصرہ کتاب ''نظم اور تفہیم نظر'' ڈاکٹر نفیس بانو کی خوبصورت تخلیق ہے۔ ڈاکٹر نفیس بانو بہت لکھنے پڑھنے والی خاتون ہیں۔ آج کے دور میں اس طرح کے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کی دیگر مطبوعات میں ''تہذیب الاخلاق: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' ۱۹۹۳ء میں، ''سرسید کے فکری زاویے'' ۲۰۰۵ء میں، ''ترقی پسند شعری وفکری رویے'' ۲۰۱۰ء، ''سرحد ادارک'' ۲۰۱۵ء میں اور ''نظر نظر منزل'' وغیرہ منظر عام پر آ چکی ہیں جو کہ مختلف موضوعات پر عمدہ کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر نفیس بانو ایک نقاد ہی نہیں بلکہ ایک محقق کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان

کی تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی وشعری کتابیں اردو زبان وادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر نفیس بانو تحقیق، تنقید و دیگر موضوعات کے میدان میں سرگرم ہیں اور بنارس کو گہوارہ بنایا۔ ان کی ادبی ذوق بڑی قابل تعریف ہے۔ انھوں نے مختلف مضامین میں شخصیات کے خیالات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ تہذیبی، اخلاقی، شعری فکری وفنی موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے، اردو زبان وادب ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان کی ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں اردو زبان وادب کا بڑا اہم رول ہے۔ اسی طرح ان کی تحریریں بڑی دلچسپ ہیں اور دیگر کتابیں ہماری معلومات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مضامین کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کے مضامین میں متعلقاتِ سرسید اور فیضان سرسید کا احساس کیا جاتا ہے۔ مضمون کے آغاز میں ٹیپو سلطان کے جذبات، حب الوطنی اور دلیرانہ شخصیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ٹیپو سلطان نے ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی۔ جب کہ مؤرخین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر میں دیکھا اور دانشوران ملک وقوم نے ۱۸۵۷ء کے غدر کو تجزیاتی نقطۂ نظر سے پرکھا، مگر یہاں اسی تناظر میں ادبی حوالے سے آئین عکس کیا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات ومیلانات پر حتی الامکان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں سرسید اور ان کے رفقا کی امتیازی شان وشوکت کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے، وہیں سرسید اور اکبری کو بخوبی پیش کیا ہے۔ تعلیم نسواں کے علم بردار 'شیخ عبداللہ' اور مجاہد آزادی حسرت موہانی پر اہم مضامین لکھے گئے ہیں۔ حصہ اول کے آخری مضمون میں سرسید اور ابوالکلام آزاد کے تقابلی مطالعہ نے اس کتاب کو چار چاند لگادیے ہیں۔ اس کتاب کے مضامین کے دوسرے حصے میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو مقامی وتہذیبی حوالوں سے دیکھا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں جتنے بھی مضامین شامل ہیں بے حد اچھے اور معلوماتی ہیں۔

کتاب ''نظر اور تفہیم نظر'' کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت جملوں میں گہرائی اور حسن کاری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی چاشنی موجود ہے۔ مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم اس عہد میں چلے گئے ہوں جو اردو ادب کے عروج اور زبان دانی کا دور تھا۔ بہر حال علمیت سے بھرپور زبان خود دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور طباعت صاف ستھری ہے۔ امید قوی ہے کہ علمی وادبی حلقے میں ان کی دیگر تصنیفات و تالیفات کی طرح اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور قارئین ہاتھوں ہاتھ لے کر اس کی خواطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

تبصرہ نگار: سنتوش کمار
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔7، موبائل: 7827582645

گفتگو کتابوں سے

تصنیف: منیر سیفی
صفحات: ۱۸۴، قیمت: ۳۰۰/روپے
ملنے کا پتہ: منیر سیفی، مالک لین، سمن پورہ، وی، بی، سی، پٹنہ (بہار)

زیر تبصرہ کتاب پولیس محکمہ سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر منیر سیفی کے تنقیدی اور تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے، منیر سیفی کا اصل میدان شاعری رہا ہے، شاعری کے حوالے سے ''اجنبی صدا، دعا کا شجر، پھول خوشبو ہوا، دیدۂ عبرت نگاہ'' کے نام سے ان کے مجموعہ ہائے کلام بھی منظر عام پر آچکے ہیں، منیر سیفی نے کتاب کے انتساب میں ایک شعر تحریر کیا ہے:

کتابوں کے سوا دنیا میں سیفی
مرا کوئی ملاقاتی نہیں ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر سیفی کتابوں سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں، شاید اسی مناسبت سے انھوں نے اپنے تنقیدی اور تبصراتی مضامین پر مشتمل اس کتاب کا نام بھی ''گفتگو کتابوں سے'' رکھا ہے، اس کتاب میں ۲۳/مضامین شامل ہیں، چوں کہ منیر سیفی خود شاعر ہیں، اس لیے بیشتر مضامین شاعر اور شاعری کے حوالے سے ہیں، اس کے علاوہ مختلف کتابوں پر تبصرے ہیں، منیر سیفی کی عادت ہے کہ جس شخصیت کے حوالے سے کوئی مضمون تحریر کرتے ہیں، تو تاریخی اور جغرافیائی حالات پر خاص توجہ دیتے ہیں اور موضوع میں مکمل طور پر گم ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کا یہ انداز بطور خاص ''حیرت مرادآبادی کی اساس حیات''، ''پروفیسر شکیل الرحمٰن (بابا سائیں)'' اور ''سید شکیل دسنوی کا شعری آفاق'' وغیرہ مضامین میں دیکھ سکتے ہیں۔

منیر سیفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ فنکار کے بجائے ہمیشہ فن اور فن پارہ پر توجہ دیتے ہیں، خواہ نثری تحریر ہو یا شعری؛ ہر جگہ انہوں نے اسی رویہ کو اپنایا ہے، اسی وجہ سے انہوں نے اپنی اس کتاب پر نہ تو اپنا تعارف تحریر کیا ہے اور نہ ہی کسی سے مقدمہ یا دیباچہ وغیرہ لکھوایا ہے؛ بلکہ ''حیرت مرادآبادی کی اساس حیات''، مضمون میں اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے: ''اہل قلم بڑے عالی ظرف اور وسیع القلب ہوتے ہیں، لوگوں کی دل بستگی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے، جب ان سے گزارش کی جاتی ہے، تو بر بنائے اخلاق وتعلق تعریفی مضامین لکھ دیتے ہیں، جو کتاب کی زینت بن جاتے ہیں اور قارئین کا ذہن کلام پڑھنے سے قبل مطمئن ہو جاتا ہے، اس لیے بندۂ عاجز نے اس عمل سے پرہیز کیا''۔

اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین تاثراتی ہیں، زبان عمدہ، عام فہم اور سلیس ہے، اسلوب میں بھی روانی، برجستگی اور پختگی ہے، شاعر کے متعلق جو مضامین لکھے ہیں، ان میں ڈائری اور تذکرہ والا انداز ہے، ''مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعرا'' مضمون میں تاج پیامی کا تعارف اس طرح کرایا ہے ''ڈاکٹر تاج پیامی باغ وبہار، سمندر بے کنار، لامتناہی سلسلۂ کوہسار، مترنم آبشار اور

دشت میں سایۂ دیوار قسم کے آدمی ہیں''۔ منیر سیفی کے تنقیدی مضامین میں تخلیقیت کی بو آتی ہے، تشبیہات واستعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

''گلاب رنگ وقیع منظر'' کے عنوان سے مضمون میں منیر سیفی نے دوہوں اور ہندی شاعری پر جس انداز سے فنی گفتگو کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوہوں اور ہندی شاعری کے رموز پر بھی گہری گرفت رکھتے ہیں، یہ مضمون بہت مختصر ہے، مگر ہندی عروض کا تعارف اچھے انداز سے کرادیا ہے۔ منیر سیفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہیں، تو ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا تبصرہ کررہے ہیں یا اس موضوع پر علاحدہ مضمون تحریر کررہے ہیں، اس لیے کہ وہ منظر سے زیادہ پس منظر پر توجہ دیتے ہیں اور اس کی وجہ ان کا گہرا مطالعہ اور تاریخ وجغرافیہ پر گرفت ہے، اس چیز کو ان کے پہلے ہی مضمون ''داستان جزائر انڈمان نکوبار اور ۱۸۵۷ء'' میں پڑھا جاسکتا ہے، اس میں انہوں نے کتاب کے تعارف کے حوالے سے چند سطریں تحریر کی ہیں اور خود ہی جزیرۂ انڈمان کی تاریخ اور خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ لگتا ہے خود اپنا سفرنامہ لکھ رہے ہیں۔

مجموعی طور پر کتاب بہت عمدہ ہے، موضوعات کے انتخاب میں بھی جدت ہے اور اندازِ تحریر میں بھی، امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے۔

تبصرہ نگار: عبدالباری
ڈی 29، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو پارٹ 2، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

لیکن

شاعر: افضل حسین افضلؔ
صفحات: ۱۸۷، قیمت: ۲۵۰/روپے
ملنے کا پتہ: اردو گھر، 3 جی مومن پور روڈ، خصر پور، کولکاتہ

فکر وفن کو پختگی مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ اور ریاضت سے ملتی ہے۔ ندرت خیال کے دریچے اسی سے وا ہوتے ہیں تو افکار تازہ کی ہوائیں بھی یہیں سے چلتی ہیں۔ افضل حسین افضلؔ جدت طرازی کی اسی رہ گزر کے رہرو ہیں جہاں روایت کی پاسداری کرتے ہوئے انھوں نے اپنی انفرادیت مستحکم کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کی قرأت کے دوران لطافت بیان اور شیرینی زبان عروج پہ نظر آتی ہے۔

افضل حسین افضلؔ کا اولین سخن بیانیہ 'لیکن' فرسودہ روایات کو جزو تخیل بنانے والوں پر سوالیہ نشان لگاتا ہے کہ راہ نو کا تعین کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ یہاں سہل پسندی روا نہیں، دشوار پسندی کو شعار بنانا پڑتا ہے۔ بقول خود:

ترے اشعار میں ندرت ہے افضل
تری غزلوں کا تیور بولتا ہے
نکلیں گے اور زاویے تیرے جمال کے
ہوگا کبھی جو تجزیہ میرے کلام کا

انھوں نے ندرت تخیل کے لیے جن تشبیہات وعلائم کا سہارا لیا ہے اس سے نغمگی وسلاست دوچند ہوگئی ہے:

اداسی بال کھولے سوئی ہو پختہ عمارت میں
مسرت سے ہو پُر مٹّی کا گھر، ایسا بھی ہوتا ہے

ہم اپنی ذات سے خود جلتے بجھتے ہیں اندھیروں میں
خدا شاہد ہے جگنو منّت آتش نہیں کرتے

آشفتہ ہوا لے اُڑی لیکن پس ہجرت
خوشبو کا سفرنامہ غم انگیز بہت ہے

زبان میرؔ وغالب کی زلف گرہ گیر کے اسیر افضل حسین افضلؔ اسے سحر اور شگفتہ گل کی خوشبو مانتے ہیں:

یہ دنیا جس کو جادو بولتی ہے
اسے تہذیب اُردو بولتی ہے
خموشی میں ہے گویائی کا پہلو
شگفتہ گل کی خوشبو بولتی ہے

زبان سے قربت اور تابندگی فکر انھیں درد کو بیدار اور اشک افشانی سے چشم تر کو معمور رکھنے پہ مہمیز کرتی ہے:

درد بیدار بھی ہے، فکر بھی تابندہ ہے
آنکھ روتی ہے تو لگتا ہے کہ دل زندہ ہے

غزلوں کے شانہ بہ شانہ منظومات (آمد، لیکن، بنت ابلیس، تصویر کا دوسرا رُخ، عدم شناخت، بین، ایک منظر، خوبصورت تجویز، سنجیونی، التماس مریم، خواب نیم شب، تمھارا کیا ہے، اندیشہ، دعائے خیر، صوابدید) میں بھی انھوں نے فکر وفن کے جوہر دکھلائے ہیں۔ ابوالکلام رحمانی، انیس رفیع، ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر افصح ظفر، پرویز اختر، سید محمد زماں اور عبدالمنان کی آرا سے مرصع 'لیکن' کی یہ شاعری مزید استحکام، پختگی اور ندرت کی طالب ہے:

سرتاقدم طلب ہوں، مجھے حسب خواہ دے
ہر زاویے سے دیکھنے والی نگاہ دے
طے ہوچکے سفر میں مراحل شعور کے
نکلے جو لاشعور کی جانب وہ راہ دے

تبصرہ نگار: سعید اختر اعظمی
نزد جامعہ الفلاح پوسٹ بلیریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی)

◆◆◆